منظومات اقبال (بانگ درا) میں نوآبادیاتی تبدیلیاں، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

ساجد جاوید

Abstract.

Allama Iqbal was the top most voice of Urdu poetry in 20th century. He iscalled the poet of the East in subcontinent. He wasbrought upandgoteducationincolonialeraof subcontinent under the educational system given by the English rulers.He observed the positive andnegative aspects of the colonial rule and the customs ofthe colonizers here. He keenly examined the colonial behaviors with the natives specially the Muslims of India. He, in his first Urdu poetry book (Bang-e-Dara), criticized the colonial unwanted social, economic and educational changes in the society and presented his anti-colonial theory in the book named Bang-e-Dara. This article shows the Post-Colonial study of this book by Iqbal along with his anticolonial Theory.

1857ء کے بعد تاج برطانیہ نے پورے طمطراق کے ساتھ برصغیر پر حکمرانی کا آغاز کیا۔اس کے بعد کے منظرنامے سے ہندوستانیات کی تاریخ میں تین نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوتا ہے جن کو colonizer, colony and colonized کے الفاظ سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے جنگ آزادی اور انگریز حکمرانوں کی طرف سے غدر کے تصور نے کئی سال فریقین کے درمیان موجود دشمنی کی نظر کر دیے۔جب حاکموں کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو دانشمندی سیان کی کولونیل پالیسی میں دیگر عناصر شامل کیے گئے تا کہ معاون پالیسیوں کی مدد سے مقامیوں کو رام کیا اور مطیع بنایا جا سکے۔ان پالیسیوں سے ہندوستان میں جزوی یا کلی تبدیلی کے مطالعے کو عصر حاضر میں مابعد نوآبادیاتی مطالعہ یعنی Postcolonial Study، سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس عہد میں حکمرانی کے انداز اور پالیسیوں کو اقبال جیسے رہ نوردشوق نے جس نظر سے مشاہدہ کیا اور اپنی شاعری میں برتا، انکے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے انکی شاعری کو دیکھا جانا ضروری ہے کہ ایک شاعر، ایک مقامی فرد، ایک طالب علم، ایک محقق اور ایک ناقد کے فکر و خیال سے کیا کیا تبدیلیاں اردو ادب کے منظرنامے کا حصہ بن رہی تھیں (اس مقالے میں انکا موضوعی مطالعہ

پیش کیا جاتا ہے)۔

علامہ اقبال کی شخصیت کے جائزے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے فرد اور آگے چل کر ایسے شاعر بنے جنھوں نے اپنی ساری زندگی سیاسی طور پر ایک نئے بنے ہوئے سیاسی نظام میں بسر کی جس کو استعماریت یا نوآبادیات کی اصطلاح سے جانا جاتا ہے۔اقبال کی سیاسی فکر کی یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نے صرف انگریز عہد کو ہی بطور خاص اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھا تھا اس لیے نوآبادیاتی دور کی جو تفہیم اور تبدیلیاں انکے فکر ونظر کا حصہ بنیں وہ خالصتا" ایک مقامی فرد کی میراث تھیں۔ان کی بنیاد کسی مستعار فکر کی بجائے ان کے مشاہدات اور تجربات پر تھی۔اس پر مستزاد اقبال کا (1905ء میں) جرمنی اور یورپ کی سرزمینوں کا سفر تھا جس نے انکو یورپی افراد اور قوم کے اندرون اور بیرون کو سمجھنے میں معاونت کی۔ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1901ء میں رسالہ مخزن میں شائع شدہ نظم ہمالہ سے ہوا(1)۔(اس سے قبل مقامی مشاعروں میں وہ شرکت کرتے رہے تھے)۔ یہ نظم انکے شاعری میں وطن پرستی اور رومانوی رجحانات کی عکاس تھی۔ یہ رومانویت کے رجحانات اس تعلیمی سلسلے کی دین تھے جو انگریز عہد میں ہندوستان بھر میں رائج رسمی تعلیمی کی صورت میں نافذ ہو چکا تھا۔اقبال کا سکول، کالج اور پھر سیالکوٹ سے ہجرت کر کے لاہور میں یونیورسٹی میں داخلہ لینا وہ ابتدائی نوآبادیاتی تبدیلی تھی جس نے محمد اقبال کو علامہ اقبال بننے میں خاصی مدد دی۔اس مقالے میں وہ چار بڑے پہلو دیکھے جاسکتے ہیں کہ کس طرح اقبال کے ہاں کولونیل تبدیلیاں آئیں۔ان میں پہلا زاویہ یہ کہ وہ خود انگریزی تعلیم حاصل کر کے اپنے فکر ونظر میں تبدیلی لاتے ہیں۔دوسرا یہ کہ مغربی تعلیم ایک ہندوستانی ادیب کی لکھت کا کس انداز سے حصہ بنتی ہے۔تیسرا زاویہ یوں کہ مغربی سفر اور انکا مغربی اقوام کو مشاہدہ کرنا اور اس سے ان کے بارے میں اپنی ذہن سازی کرنا بڑی تبدیلی بنا۔چوتھا یہ کہ وہ مقامی ثقافت کو منفی انداز سے متاثر کر دینے والے کولونیل عوامل کو رد کر کے اپنا ردنوآبادیاتی زاویہ (انٹی کولونیل) کس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ذیل میں ان عناصر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اقبال نے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران مغربی شعرا کا مطالعہ کیا تو اپنی شاعری کے موضوعات کا آغاز فطرت پر مبنی موضوعات سے کیا۔مغربی ادب کے مطالعے سے ایک رجحان قبول کیا جو فطرت، خدا اور انسان کو موضوع بناتا تھا۔ یہ رجحان یورپ میں بالعموم اور فرانس میں بالخصوص ایک توانا ادبی تحریک بن کر ابھرا، جس کو رومانوی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ادبی تحریک نہ تھی بلکہ سماجی تبدیلی کی ایک آواز تھی جو روسو نے بلند کی تھی(2)۔اس سلسلے میں فرانس اور آگے چل کر باقی ممالک میں عقلی استدلالیت، تفکر جذبہ، وجدان، انسانی آزادی کی بحثیں مختلف علوم اور ادب کا حصہ بنیں۔انسان کی وہ آزادی جو پیدا ہوتے ہی اس کو فطرت دے کر بھیجتی ہے، اس پر معاشرہ اور افراد اور مظاہر حیات جس انداز سے قدغنیں لگاتے ہیں، انکو قبول نہ کرنے کا ایک باغیانہ اظہار تھا۔ یہ اظہار یورپی شعرا (ورڈزورتھ وغیرہ) نے بطور موضوع قبول کیا تھا۔کولونیل دور کی تعلیمی پالیسی کی عملی صورت انجمن پنجاب لاہور میں اطلاق کی گئی جس میں نوآبادکار کی سوچ نے مقامی افراد کی مدد سے اردو شعر وادب میں تبدیلی

پیدا کی۔اس کی بدولت غزل کے موضوعات کو ریزہ خیالی سے نکال کر شعری روایات کو ان رومانوی موضوعات سے روشناس کیا جو یورپ کی شاعری میں باقاعدہ تحریک کی صورت میں موجود تھے اور ان رجحانات کو اردو شاعری میں باضابطہ استعمال میں لانے والے اولین شعرا میں اقبال سرفہرست تھے۔یہ وہ تبدیلی تھی جو نوآبادیاتی عہد اور تعلیمی نظام سے انکی فکر کا حصہ بنی۔پروفیسر نواز صدیقی لکھتے ہیں،

> ''ہندوستان میں انگریزی زبان وادب کے وسیلے سے انیسویں صدی میں رومانیت داخل ہوئی اور نصاب تعلیم کا حصہ بن گئی۔ان رومانوی شعرا میں متصوف ورڈزورتھ، شیلی، کولرج، بائرن، کیٹس اور والٹر سکاٹ کے ناول شامل تھے۔اس طرح تعلیم یافتہ کے ذہن وقلب پر رومانیت چھا گئی۔عبدالحلیم شرر نے والٹر سکاٹ اور الیگزنڈر کی تقلید میں تاریخی ناول لکھنے شروع کیے جس میں قرون وسطی کا رومان تھا، کیونکہ ازمنہ رفتہ کا نئے سرے سے بیدار ہوجانا ہی رومانیت ہے۔علامہ اقبال بھی اس رومانوی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔''(3)

علمی سطح پر نوآبادیاتی تبدیلی رومانوی تحریک کے مرہون ہے جو یورپ میں ایک صدی قبل سماج اور ادب کے مختلف شعبوں میں نہ صرف یہ کہ موجود تھی بلکہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر انسانی سوچ میں وسعت اور بغاوت کے عناصر کو جنم دے رہی تھی۔فرانس سے اس رومانوی تحریک کے سرخیل روسو کی آواز نے انگلستان کے شعرا کو بھی متوجہ کیا تھا جس سے شعروادب میں رومانویت کے نظری اور باغیانہ عناصر در آئے۔اقبال نے ان عناصر اور اس تحریک کے شعرا کا مطالعہ کیا تو یہ رومانوی موضوعات ان کی شاعری میں آتے چلے گئے۔ابھی جذبات تند تھے لیکن تجربہ خام تھا۔چنانچہ اس دور میں یورپ کے بعض اہم شعرا کے نہ صرف خیالات کو اپنے اندر سمو کر کلام لکھنا شروع کیا بلکہ بعض نظموں میں انکا نام بطور حوالہ پیش کر کے نظمیں تخلیق کیں جس سے انکی شاعری کا ایک عمدہ اور متاثر کن آغاز سامنے آیا۔رومانوی شعرا فطرت، خدا اور انسان (بچہ) کی تکون کو اپنے کلام میں لاتے تھے،اسی انداز سے اقبال کے شروع دور کی نظمیں اس رومانوی تکون کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔بانگ درا میں 1905ء سے قبل کا کلام (جس کو پہلے دور کا کلام لکھا گیا ہے) بچوں سے متعلق موضوعات پر مشتمل نظموں پر ہے۔پہلی نظم ہمالہ (1901ء) فطرت کی طرف اقبال کے طبعی جھکاؤ کو سامنے لاتی ہے۔خدا بطور سپریم طاقت کے جاندار موضوع سخن بنتا ہے۔جن یورپی شعرا کے کلام سے اقبال متاثر ہوئے،ان میں ولیم کوپر (نظم ہمدردی) لانگ فیلو (پیام صبح) ٹینی سن (عشق اور موت) ایمرسن (رخصت اے بزم جہاں) جیسے نامور شعرا کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔بیسویں صدی کے شروع میں جبکہ ابھی اردو شعری روایت نظم کی طرف جھکاؤ لا رہی تھی،اس میں ان یورپی شعرا کا مطالعہ کر کیان سے اخذ شدہ شعری تصورات ایک تو اقبال کی شعری پرداخت اور اٹھان کی دلالت کر رہے تھے دوسرا یہ وہ ادبی تبدیلی تھی جو نوآبادیاتی عہد کے تعلیمی نظام کی وجہ سے ان کے مطالعے کا حصہ بن رہی تھی۔رومانویت یورپ میں مروجہ اخلاقی

معیارات اور جمالیات کے سانچوں سے بغاوت کا نام تھا۔اقبال کا شعری موضوعات کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کرنا وہ دوسری اہم بڑی نوآبادیاتی تبدیلی تھی جو پوری شدت سے انکے کلام کا حصہ بنی۔برٹرینڈ رسل رومانیت اور اس تحریک کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

> ''رومانیوں کا مقصد امن وسکون نہیں بلکہ پرزور اور شدید جذباتی انفرادی زندگی تھا۔۔۔قومیت کا اصول جس کا بائرن علمبردار تھا اسی فلسفے کی توسیع تھا۔ایک قوم وہ نسل تصور کی جاتی ہیجو مشترکہ آباؤاجداد کی اولاد ہیں اور ایک ہی خونی شعور رکھتے ہیں۔۔۔رومانی تحریک جزوی طور پر اشرافیہ اور جزوی طور پر حساب کتاب پر جذبات کو ترجیح دینے کے باعث تجارت اور زر سے شدید نفرت کرتی ہے۔یوں یہ سرمایہ داری کی مخالفت کی داعی بن جاتی ہے۔یہ رویہ ایک سوشلسٹ کے رویے سے مختلف ہے۔کیونکہ موخرالذکر پرولتاری کے مفاد کی نمائندگی کرتا ہے۔''(4)

تعلیم دوسرا بڑا موضوع اور زاویہ ہے جس کی ذیل میں اقبال کے افکار کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کو حکومت اور عوام کے درمیان جڑتے ہوئے اس نئے تعلق کے عنصر کے طور پر دیکھا جانا چاہیے جس کے نتیجے میں ان کے درمیان دوریوں اور نفرتوں کو کم ہوتا دیکھا جا سکتا ہے۔اس تعلیمی پالیسی کا سب سے اہم عنصر وہ نصاب سازی تھا جس سے نئے ذہن کو نئی جہات سے روشناس کرانا اور اسکو سائنسی ذہن میں تبدیل کرنا مقصود تھا۔اقبال کی شخصیت کو نوآبادیاتی عہد کے ایک طالب علم کے طور پر بطور مثال دیکھا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے دور دراز کے شہروں میں بھی نئی اور رسمی تعلیم دو صدیوں میں ہی اپنا آپ منوا چکی تھی۔1857ء کے بعد تعلیمی میدان میں سرسید نے مسلمانوں کے رہنمائی کا حق ادا کر دیا۔برصغیر کی تاریخ تعلیمی میدان میں انکی خدمات کو ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے گی۔سرسید کی عملی مساعی نے ہندوستان میں تعلیمی تحریک کو تیز کرنے کیلیے تمام ممکنہ کوششیں کیں۔ان کوششوں سے بیس تیس سال میں مقامی نوجوان طبقہ سنجیدگی سے نئے تعلیمی نظام کا حصہ بنا۔اقبال کا بھی سیالکوٹ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور جانا اور وہاں سے مزید اعلیٰ تعلیم یعنی پی ایچ۔ڈی کیلیے یورپ کا سفر کرنا اسی نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی کا تسلسل تھا جس پر چلتے چلتے اقبال فکر و فلسفے کی شاہراہ کے مسافر بنے۔وہ سرسید کی فراست اور عملی کام کے معترف رہے جس کا اظہار انکی نظموں میں ملتا ہے۔"سید کی لوح تربت پر"(نظم) انکی علمی اور مذہبی خدمات کو ان الفاظ میں ہدیہ تبریک پیش کیا ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تیری تحریر سے
دیکھ !کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جواب نہ آئیں،ان فسانوں کو نہ چھیڑ(5)

محررہ بالا قطعہ نظم اس فکری،تعلیمی اور تہذیبی وراثت کا اشاریہ بنتا ہے جو اقبال کو منتقل ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔سرسید کی طرف سے ان نصائح کا اعادہ کیا جائے تو ہمیں اس دور میں جدید خیالات کا پرتو بنتا ہے جس میں ایک مدبر دوسرے مفکر کو نصیحت کر رہا تھا کہ دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کا حصول،اس دور میں بدلتے وقت کا تقاضا تھی۔نیز یہ کہ اس وقت فرقہ بندی مسلمانوں کی اجتماعیت کیلیے تباہ کن ثابت ہوسکتی تھی۔اور ایسے سیاسی حالات میں مسلمانوں کے اندر اتفاق کا ہونا انکی بقا کیلیے ضروری تھا۔کسی قسم کی پھوٹ انکو مزید کمزور کرسکتی تھی۔ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملے میں سرسید اور اقبال کی فکر و فراست ہم آہنگ تھی۔علامہ اقبال نے 1904ء میں ایک مضمون بعنوان" قومی زندگی" لکھ کر ادبی رسالے مخزن میں شائع کیا تھا۔اس مضمون میں ہندوستانی مسلمانوں کی کمزوریوں کا ایک دانش ور کی نظر سے تجزیہ کیا گیا تھا۔اس مضمون کا حاصل مطالعہ آج کے حالات میں بھی نیا نیا دکھائی دیتا ہے۔وہ لکھتے ہیں،

''اگر مسلمانوں کو دیکھا جائے تو انکی حالت مخدوش نظر آتی ہے، یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے،صنعت کھو بیٹھی ہے،تجارت کھو بیٹھی ہے۔اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہوکر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔اور باتیں تو خیر،ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوجاتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔غرضیکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیرالامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ہیکہ اتحاد و یگانگت کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''(6)

مذکورہ بالا نظم کے مطالعے سے شاعر کی ایک اہم ذمہ داری کا یہ تعین ہورہا ہے کہ اب وصل کے اسباب پیدا کیے جانے کا وقت ہے نہ کہ کسی ایسی تحریر کا مقام آجائے کہ دل زخمی زخمی ہوجائے۔محفل نو میں پرانی داستانوں کے ذکر کی ممانعت اس لیے ضروری تھی کہ یہ وہ فسانہ متروک ہے جس پر اب کبھی رنگ برگ و بار نہیں آسکتا۔اس نظم میں سرسید کی فکر ایک نوجوان شاعر کو یہ تلقین کرتی نظر آرہی ہے کہ اپنی شاعری سیسننے والوں کو جگانا اور خرمن باطل شعلہ آواز سے جلایا جانا اس شاعر کی مساعی سے ممکن ہے۔ان تعلیمات پر اقبال کا ردعمل کتاب کے اسی حصے میں نظم"

تصویرِ درد" میں یوں ظاہر ہوتا ہے،

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے(7)

بانگ درا کے تیسرے حصے کی نظموں (1922ء-1908ء) کا آغاز نظم "بلاد اسلامیہ" سے ہوتا ہے۔اس نظم کے اقبال کے نظریہ قومیت کا باقاعدہ آغاز دیکھا جاسکتا ہے۔یہ قومیت ایک تو اس رومانوی رجحانات کی عملی صورت کے طور پر نظموں میں در آئی تھی۔دوسرا یہ کہ کالونیل مائنڈ سیٹ ماسٹرز کو اس بات کا جواب دینے کیلیے بھی ہندوستان کے تابندہ اور قابل فخر نقوش کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا عظیم الشان ماضی وحال کا منظر نامہ دکھانا مقصود تھا جو یہاں کے رہنے والوں کو غیر مہذب گردانتا تھا۔نظم بلاد اسلامیہ کو ہمالہ (نظم) کی توسیع کہا جائے تو یہ بات بے جا نہیں۔پہلا شعر دلی کی سرزمیں کی تعریف واہمیت سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں،

سرزمیں دلی کی مسجود دل غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
ہے زیارت گاہ مسلم گو جہان آباد بھی
اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی

اس طرح اقبال دلی، بغداد، حجاز، زمین قرطبہ، یورپ، خطہ قسطنطنیہ، حرم پاک اور ابوایوب انصاری سے ہوتے ہوئے نبی مکرم کی ذات پاک سے والہانہ عقیدت کے پھول نچھاور کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس کے بعد واپس ہندوستان پر روئے سخن کا اختتام کرتے ہوئے اور اپنی سرزمین پر رشک کرتے ہوئے اس کو خصوصی اہمیت کا حامل گردانتے ہیں۔

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہی تو اس چمن میں گو پر شبنم بھی ہیں ہے اگر

قومیت اسلام پابند مقام
ہند ہی بنیاد ہے اسکی نہ فارس ہے نہ شام(8)

اس اشعار میں وطنیت کا جو جذبہ نظمایہ گیا ہے وہ اس عہد میں نوآبادیاتی تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں وطن سے محبت اور حریت کے موضوعات دوسرے ہم عصر ادیبوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں (جن کا ذکر مقالے کا حصہ نہیں ہے)۔ یہ وطنیت کا تصور اصل میں قوم پرستی کے جذبے اور موضوع کی طرف عملی قدم تھا جو رومانوی فلسفے کی شکست کے سلسلے میں سامنے آیا۔ پروفیسر محمد حسن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''اقبال کا دور عالمی سطح پر رومانیت کے خوابوں کی شکست کا دور تھا۔ رومانیت نے فرد کو سماجی فلاح کے سبھی فلسفوں اور نظریوں کا پیمانہ قرار دیدیا تھا اور ضابطہ و آئین کی بجائے فرد کی اولیت تسلیم کرلی گئی تھی۔ اس سے قوم پرستی کا میلان بھی ابھرا اور لبرل ازم کی آزاد خیالی اور مارکسزم کی انقلابی روح نے فروغ پایا۔ اقبال کا دور آتے آتے فرد مشین کے آگے خود کو بے بس محسوس کرنے لگا اور قوم پرستی دوسرے ممالک کو غلام بنانے والے سامراج اور فاشزم کی شکل اختیار کرنے لگی۔''(9)

موضوعات کی سطح پر دیکھا جائے تو کچھ نظموں کے عنوانات براہ راست نوآبادیاتی عہد سے جڑتے دکھائی دیتے ہیں جن کو اس ضمن میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کی اقبال کے عہد میں ایسی اہمیت ضرور ہوگی کی انھوں نے اپنے کلام میں میں ان کو محفوظ کردیا۔ ان میں ایک نظم بعنوان غلام قادر روہیلہ، دوسری بعنوان شیکسپیئر، اور تیسری نظم موٹر ہے۔ غلام قادر روہیلہ نوآبادیاتی عہد کی تاریخ میں ایک اہم کردار تھا جس نے اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی کے محل میں گھس کر اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر کر اندھا کرڈالا تھا اور یہ واقعہ انگریزوں کے استعماری مقاصد کی انجام دہی کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔ اور اس کے بعد دیکھیں تو انگریزوں نیا یک دم تجارتی مقاصد سے حکمرانی کے مقاصد کے تحت خود کو تیار کرنا شروع کردیا تھا۔ میر وسودا اور دیگر کلاسیکی شعرا نے اپنے طور اس کو موضوع بنایا، اقبال کی نظم میں ایک دکھ بھری فضا کا سماں دکھائی دیتا ہے۔ نظم کا آخری شعر ان کے درد کا عکاس بنتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

شیکسپیئر نظم میں اس نابغہ روزگار کلاسیک شاعر کو ایک جدید عہد کا شاعر جس خلوص اور اپنائیت سے خراج تحسین پیش کرسکتا ہے، وہ یہاں ملتا ہے۔ انکو، انکے کلام کو، ان کی ہستی کو، اور انکی شاعری کے اسرار کو شاندار انداز سے سپرد قلم کیا گیا ہے۔ نظم موٹر کو دو طرح سے دیکھا سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک تو موٹر استعارہ بنتا ہے اس جدید سواری اور

انگریزوں کے لائے گئیٹر انسپورٹیشن سسٹم کا جس نے 1857 کے بعد ہندوستان میں مقامی سسٹم کی جگہ لی اور اقبال اس تبدیلی کو مثبت لیتے ہیں۔ دوسرا اس نظم کو علامتی انداز سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ کہ موٹر تیز لیکن خاموش ہے، مطلب نئی تبدیلی غیر محسوس انداز سے ہندوستانی معاشرے کا حصہ بن کر قبولیت پا رہی ہے۔ ایک اور زاویہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اقبال کے پیش نظر محض ہندوستان ہی کا درد موجود نہ تھا بلکہ مشرق وسطیٰ میں دیگر مسلم ممالک کی کمزور اور استحصالی حالت کو انھوں نے اپنے طرز احساس میں شامل رکھا تھا۔ یہ نوآبادیاتی دور مسلم ممالک کی اکثریت پر بھاری گزر رہا تھا جس سے کسی بھی حساس دل رکھنے والے شاعر کا بے چین ہوجانا فطری تھا۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد اقبال کا نظم طلوع اسلام تخلیق کرنا ایک اور انداز کی تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے (جس پر راقم کسی دوسرے مضمون میں تفصیل سے بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے)۔ عالم اسلام کا سیاسی منظر نامہ اس اقتباس سے واضح ہوسکتا ہے،

> ''تاریخ کا جائزہ لیں تو اس دور میں 1907ء میں روس اور برطانیہ نے ایران کا بٹوارہ کر کے یہاں اپنے حلقہ اثر قائم کر لیے، دوسری طرف 1911ء میں بنگال کی تقسیم کو ہندوؤں کی خوشنودی کیلیے منسوخ کر دیا گیا۔ اسی سال اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا، مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔ 1912ء میں بلقان کی متحدہ فوجوں نے ترکی کے یورپی علاقوں پر حملہ کر دیا۔ 1914ء میں جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا۔ پھر 1918ء میں جنگ عظیم تو ختم ہوگئی لیکن کئی ایک اسلامی ممالک کو خاک وخون میں نہلا گئی۔ فرنگی نے مکاری سے کام لیتے ہوئے عرب اور ترکوں کو آپس میں لڑا دیا اور یوں 1870ء سے 1918ء تک پورا اسلامی بلاک یورپ کے قبضے میں آ گیا۔ (10)

اقبال کے ہاں کولونیل سیٹ اپ سے مرعوبیت کی بجائے اس پر تنقید کرنے کا ایک مزاحمت آمیز رویہ سامنے آتا ہے جس کو آج کے مابعد نوآبادیاتی عہد میں ردنوآبادیاتی رویہ (Anti-Colonial Behavior) کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں اکبر الہ آبادی بھی ردنوآبادیاتی شاعر کے طور پر معروف ہو رہے تھے لیکن اقبال کے ہاں اس رجحان کو ایک مدبرانہ شان سے برتنے کا نمونہ ملتا ہے جو انکے کلام کا خاصا ہے۔ اب تعلیم کے سلسلے میں انگریزی تعلیم کے جن جن پہلوؤں سے اقبال کو اعتراض ہوا، انکے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔ جدید تعلیم پر انکے تحفظات کو "ظریفانہ" میں شامل قطعات سے سمجھا جاسکتا ہے،

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر

وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

راقم کا خیال ہے کہ ان اشعار کو اقبال کے خیالات کا عکس سمجھنے کی بجائے،اس عہد کی معاشرتی فضا کی ترجمانی کا عکس مان لیا جائے تو زیادہ سودمند ہوسکتا ہے۔اور اگر یہ اقبال کے خیالات ہی ہیں بھی تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد تک آتے آتے وہ ان خیالات کو غیر ضروری یا غیر سنجیدہ سمجھتے تھے۔اس کی داخلی شہادت یہ ہے کہ یہ خیالات انکے ظریفانہ حصے میں موجود ہیں جن کو سنجیدہ نہیں سمجھا جانا چاہیے،دوسرا یہ کہ اگر وہ ان خیالات پر سنجیدگی سے کھڑے ہوتے تو انکو سنجیدہ کلام میں ضرور جگہ دیتے جہاں گائے اور بکری پر کلام تو موجود ہے لیکن یہ خیلالات موجود نہیں۔ہندوستان میں غیر ملکی اشیا کی امپورٹ وہ تبدیلی تھی جو تیزی سے معاشرے میں جگہ بنا رہی تھی۔یہ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام زر کے داخلے کا دور تھا جس سے ملکی سرمایہ تیزی سے باہر جا رہا تھا۔اس پر اقبال کا نظر کرنا بھی ایک نوآبادیاتی تبدیلی تھی جس سے شاعر کی ناگواری محسوس کی جاسکتی ہے۔وہ لکھتے ہیں،

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں،رومال،مفلر،پیراہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے،کفن جاپان سے

آخر میں بانگ درا میں اقبال کے ردنوآبادیاتی افکار و خیالات کا ذکر کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال بیسویں صدی کیوہ اہم شاعر تھے جو نئی تبدیلیوں کے مضر اثرات کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو رد بھی کر رہے تھے۔اس دور میں ان کے ایک اہم معاصر شاعر اکبر الہ آبادی اور اقبال کو رد استعماریت (Colonial-Anti Voice) کے شاعر کے طور پر اولیت دی جاسکتی ہے۔ردنوآبادیاتی فکر کا ایک اہم زاویہ کارل مارکس کے ذکر کو ہندوستانی معاشرے میں داخل کرنا اور انگریزوں کے مقابلے میں مارکس کے معاشی فلسفے کے اندر مقامی افراد کے مسائل کے حل کو دیکھا جانا خصوصی مطالعے کا حامل ہے۔پہلی جنگ عظیم کے تباہ کاریوں اور اس کے نتیجے میں پھیلتے افلاس اور قحط کا توڑ اقبال کو مارکس کے اشتراکی فلسفے میں نظر آیا جو براہ راست نوآبادیاتی ایجنڈے کے مخالف تھا۔مارکس سے اقبال کی متاثر ہوتی فکر ان کی معروف نظم خضر راہ میں نظر آنا شروع ہوتی ہے جب حضرت خضر سرمایہ ومحنت پر شاعر کے سوالوں کے جوابات دیتے ہیں۔کہنے کو یہ شاعر اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان دو کرداروں

یعنی مزدور اور سرمایہ دار کے بارے میں سوالات اور جوابات پر مشتمل طویل نظم ہے لیکن خضر راہ کی ایک ذیلی نظم کو پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے ہاں مارکس کی اشتراکی فکر نے جگہ بنالی تھی۔ بندہ مزدور کو یہ پیغام دینا کہ تجھ کو بہانے باز سرمایہ دار کھا گیا ہے اور صدیوں سے مزدوروں کے استحصال کا کام جاری وساری ہے۔ یہ استحصال اقبال کی مارکسی فکر سے اثر پذیری کی مثال بنتا ہے جو اس عہد میں انقلاب روس کی کہانیوں کی صورت میں ہندوستانی ادیبو ں کی فکر اور تخلیقات کا محبوب موضوع بن چکا تھا۔ اقبال لکھتے ہیں،

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اور اس کے بعد مزدور کو یہ پیغام دینا کہ اب مزدور کو اٹھنا چاہیے کہ مشرق ومغرب میں اس کے دور کا آغاز ہوا چاہتا ہے اور یہ کہ اس اشتراکی فلسفہ معاشیات سے بزم جہاں کا انوکھا انداز دکھائی دیا چاہتا ہے۔ بانگ درا کے آخری حصے (ظریفانہ) میں بھی تین چار قطعات ایسے ہیں جن میں اس موضوع پر انکے افکار ملتے ہیں۔ ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ دنیا میں سرمایہ ومحنت ایک دوسرے سے صف آرا ہوگئے ہیں جو انکے نزدیک ایک اچھا شگون ہے۔ دوسری جگہ قرآن کی ایک آیت کی تشریح کی مدد سے مزدور اور مزارع کی آویزش کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شعر ملاحظہ ہو،

حکم حق ہے لیس للانسان الا ماسعی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اس سارے سلسلے کو اس طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام، ہندوستان کے مزدور اور ہنر مند کیلیے استحصال کا بنیادی سبب تھا۔ اسکو رد کرنے کیلیے اقبال نے کارل مارکس کے نظام کو اس کے مقابل اور اس سے بہتر پایا اور اس کا بے لاگ اظہار اپنی نظموں میں محفوظ کر دیا۔ اس حصہ نظم (ظریفانہ) میں انھوں نے انگریزوں کی انفرادی اور اجتماعی طرز حیات سے ہندوستانی تہذیب ومعاشرت اور سماج میں آنے والی منفی تبدیلیوں پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بے شک روش مغربی نامناسب نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مشرقیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس کے سودمند اثرات کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ ایک قطعے میں استاد کی تعظیم کے مشرقی تصور کے حامی ہوتے ہوئے مغربی تصور کو ناپسند کرتے نظر آتے ہیں۔ استاد کی خدمات کو مادیت کے ترازو سے تولنے سے بہتر وہ مشرقی رویہ ہے جس میں خدمت استاد کے جواب میں شاگرد کا دل چاہتا تھا کی ہدیہ دل پیش کیا جائے۔ اس تعظیم کو نوآبادیاتی عہد کے بدلتے ثقافتی تصور سے بہتر گردانتے ہوئے اقبال اسکو رد کرتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کی اپنی شاعری میں

مولوی میر حسن، داغ دہلوی اور پروفیسر آرنلڈ کی بطور استاد تعظیم کے نمونے موجود ہیں۔ انگریز کے " تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے فارمولے کو بھی رد کرتے نظر آتے ہیں۔ مقامی حکومتوں کے نظام، کونسلری، ووٹ کے تصور اور اقتدار کے لئے رشوت کا تصور بھی معاشرے میں سرایت کر رہا تھا، سو اس پر بھی طنزیہ اشعار ملتے ہیں۔ وہ یورپی طرز سیاست کی بجائے اس کے اندر پائی جانے والی اخلاقی گراوٹ کے خلاف تھے۔ اس طرح کی سیاست آگے چل کر ہندوستان کے باشندوں کو مختلف گراوٹوں کا شکار بنا سکتی تھی جس کا انکو ادراک ہو رہا تھا۔ ایک اور قطعے میں اس طرح کی نوآبادیاتی سیاست کو اس انداز سے رد کرتے ہیں،

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

اوپر کی گئی ساری بحث کو سمیٹ جائے تو حاصل مطالعہ میں یہ نکات واضح ہوتے ہیں کہ اقبال نے مقامی تصور تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے قائم کردہ سکول، کالج، یونیورسٹی اور اس سے آگ بڑھ کر یورپ سفر کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی جو انکی نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی سے متاثر ہونے کی دلیل بنتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تین سال یورپ رہ کر وہ یورپی سماج اور معاشرت کے دلدادہ ہونے کی بجائے طبع مشرق کے ہی خوگر رہے اور کسی ظاہری و شخصی تبدیلی کو اپنے معمول کا مستقل حصہ نہ بننے دیا۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں نے انکو نوآبادکار کی منفی چالوں اور مقامی باشندوں کے استحصال کو سمجھنے میں مدد دی۔ اس پر پہلی عالمی جنگ میں انگریز کا منفی کردار اور ہندوستانیوں کو اپنی جنگ کا ایندھن بنانا پسند نہیں آیا اور انھوں نے اس کے خلاف قلم کو متحرک کر کے ایک مصلح کا کام سنبھالا۔ تعلیمی پالیسی کی جائز تعریف ضرور کی لیکن اس سے مقامی ثقافت میں جہاں ناموزوں تبدیلیوں کا شائبہ ہوا تو اس کا لونیل ایجنڈے کو رد کیا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں مقامیوں کی معاشی ابتر حالت سے انکی ناکامی کو دیکھا اور اس ضمن میں کارل مارکس کے تصور اشتراکیت میں ہندوستانی مزدور کی بھوک کا حل تلاش کیا اور یہ خدشہ ظاہر کر دیا کہ بہت جلد سرمایہ دار اور مزدور آپس میں باہم دست و گریباں ہونگے۔ اور آخر میں ظریفانہ کے عنوان سے مختلف قطعات لکھ کر کہیں سماجی جہالت، کہیں انگریزی سماج و استعماری حربوں، کہیں مسلمانوں کے فرقہ پرست نزاعات کہیں ہندو مسلم دوئی، اور آخر میں اپنے آپ پر طنزیہ پیرائے میں اشعار قلم بند کر کے بانگ درا کے اوراق سمیٹے اور اپنا کالونیل اور انٹی کالونیل نقطہ نظر واضح کیا۔ بانگ درا کا آخری شعر اپنے اوپر طنز کرتے ہوئے یوں قلم بند کیا،

اقبال بڑا اپدیشک ہے،من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا،کردار کا غازی بن نہ سکا

حواشی:

۱۔ احتشام علی،ڈاکٹر،جدید اردو نظم کا نو آبادیاتی تناظر،(لاہور:عکس پبلشرز،۲۰۱۹ء)،ص:۲۳۳

۲۔ روسو کے اردو ادیبوں پر اثرات کا ذکر اردو ادب کی تواریخ بالخصوص ڈاکٹر انور سدید کی کتاب اردو ادب کی تحریکیں سے تفصیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ نواز صدیقی،پروفیسر،روشن خیالی اور پاکستان،(فیصل آباد،مثال پبلشرز،۲۰۱۳ء)،ص:۵۴

۴۔ برٹرینڈ رسل ،فلسفہ مغرب کی تاریخ،ترجمہ پروفیسر محمد بشیر،(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۶ء،)ص:۷۸۴-۷۷۷

۵۔ اقبال،سید کی لوح تربت(بانگ درا)مشمولہ کلیات اقبال،(لاہور: اقبال اکادمی،طبع ہفتم،۲۰۰۶ء) ص:۸۴

۶۔ اقبال،ہماری قومی زندگی،مشمولہ اقبال کے ملی افکار،مرتبہ محمود عاصم،(لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۷۷ء)، ص:۱۶۶

۷۔ اقبال،تصویر درد،(بانگ درا)،مشمولہ کلیات اقبال،(لاہور:اقبال اکادمی،پاکستان،طبع دہم،۲۰۱۱ء)، ص:۱۰۳

۸۔ اقبال،بلاد اسلامیہ،(بانگ درا)،مشمولہ کلیات اقبال،ص:۱۷۳-۱۷۲

۹۔ محمد حسن،پروفیسر،اقبال اور عہد اقبال،مشمولہ طرز خیال از محمد حسن پروفیسر،(دہلی:اردو اکادمی،۲۰۰۵ء) ص:۱۰۰

۱۰۔ شگفتہ حسین ،ڈاکٹر،اقبال کا نظریہ اسلامی ثقافت،مشمولہ تحقیق و دریافت (فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۹ء)،ص:۱۸۱